© rasailojaraid.com

فکر و نظر............ اسلام آباد　　　　جلد: ۴۶　شمارہ: ۲،۱

کشفی بھائی! بچھڑ کے بھی تری یادوں کی رہ گزر میں رہے!

ڈاکٹر نثار احمد

(۱)

آج کے پروفیسر ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی اس وقت صرف ابوالخیر کشفی تھے جب اُن سے پہلے پہلی میری ملاقات جامعہ کراچی میں خورشید بھائی (پروفیسر خورشید احمد صاحب) کے توسط سے ہوئی۔ یہ ۶۲-۱۹۶۱ء کا ذکر ہے جبکہ خورشید صاحب کی کتاب ''اسلامی نظریہ حیات'' کی مسودہ سازی، ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں چند دوسرے حضرات کے ساتھ یہ عاجز بھی ''معاونین خصوصی'' میں شامل تھا۔(۱) (خورشید بھائی سے شرفِ ملاقات ۱۹۵۴ء سے حاصل تھا۔ اس وقت وہ جامعہ کراچی کے شعبہ معاشیات میں استاد تھے نیز ''چراغِ راہ'' کے مدیر اعلیٰ بھی۔ فقیر کا کچھ ''تعاون'' ادھر بھی تھا، خصوصاً ۱۹۶۲ء کے آزادی نمبر میں اور پھر ۱۹۶۳ء میں چراغِ راہ کے تحریک اسلامی نمبر میں) کشفی بھائی شعبہ اُردو کے استاد تھے اور جامعہ کراچی سے وابستہ ہوئے ۲ / ۳ سال ہو گئے تھے۔ میں شعبہ اسلامی تاریخ میں ایم-اے فاضل کا طالب علم تھا۔ (اور غیر سرکاری طور پر جناب ڈاکٹر امیر حسن صدیقی صاحب کی خصوصی اجازت سے ایم اے سالِ اوّل کے ابتدائی عربی کورس کا استاد بھی۔ صدر شعبہ عربی ڈاکٹر یوسف صاحب کو سخت اعتراض تھا کہ عربی ایک طالب علم کس طرح پڑھا سکتا ہے، شعبہ عربی سے استاد بلایا جائے مگر ڈاکٹر امیر حسن صاحب مرحوم و مغفور کا اصرار تھا کہ طلبہ کے مفاد میں صرف یہی طالب علم کلاس پڑھائے گا اور اگر شعبہ عربی کی طرف سے دباؤ زیادہ ڈالا گیا تو آئندہ سال یہ کورس شعبہ کے نصاب سے خارج کر دیں گے مگر اس سال یہ ''طالب علم'' ہی کورس پورا کرائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا)۔ ۱۹۶۳ء میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۶۴ء میں یہ حقیر فقیر بھی شعبہ اسلامی تاریخ کے اساتذہ میں باقاعدہ طور پر شامل ہو گیا۔ اس لیے کشفی بھائی سے ملاقات کے مواقع بڑھ گئے۔

یہ مجھے نہیں معلوم کہ کشفی بھائی سے پہلی ہی ملاقات میں ایسا کیوں لگا کہ جیسے پہلے سے جان پہچان ہے اور ان سے اچانک بے تکلفی کیسے ہو گئی۔ میں ان کو کشفی بھائی کہتا اور وہ مجھے مولوی صاحب، کبھی مولوی نثار کہتے تھے۔ وہ مجھے ہمیشہ اسی طرح مخاطب کرتے رہے، یہاں تک کہ بفرزون میں ان کے مکان پر قدرے تفصیلی ملاقات (۲۴ فروری ۲۰۰۵ء) میں اپنی کتاب ''نعت اور تنقید نعت'' پیش کی تو لکھا ''نثار کے لیے جو مولوی ہونے کے باوجود سخن فہم ہیں'' اور آخری بالمشافہ ملاقات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵راگست ۲۰۰۷ء کو عزیزم ڈاکٹر عزیزالرحمٰن کے ادارہ ''دارالعلم و التحقیق'' کے تحت مولانا زوار حسین شاہ یادگاری خطبہ(۲) (از ڈاکٹر محمود احمد غازی زیر صدارت ڈاکٹر کشفی صاحب) کے موقع پر ہوئی تو وقفہ نماز مغرب کے دوران سلام دعا، خیر خیریت کا ہی تبادلہ ہو سکا۔ پروفیسر علی محسن صدیقی بھی ساتھ تھے۔ کشفی بھائی ان سے کہنے لگے، یہ ہمارے مولوی نثار صاحب ہیں۔ محسن صاحب کہنے لگے نہیں بھائی یہ ہمارے پرانے دوست نثار صاحب ہیں۔ اس دن کے بعد کبھی کبھی ٹیلیفون پر ہی سلام دعا ہو جاتی تھی۔ بفرزون سے منتقل ہو کر ڈیفنس میں وہ اپنے بیٹے بہو وغیرہ کے ساتھ فلیٹ میں اتنی دور جا بسے تھے کہ جہاں میں ان کی زندگی میں آخر کار نہ جا سکا۔ البتہ ۱۵ مئی ۲۰۰۸ء میں ان کے انتقال کے بعد برداشت نہ ہو سکا تو برادرِ عزیز پروفیسر زاہد محمود صاحب کے ساتھ عاکف میاں سے بطور تعزیت ملا۔ ہم تینوں چند جملوں کے علاوہ زیادہ تر خاموش ہی رہے، کہنے سننے کے لیے اب کیا رہ گیا تھا؟

(۲)

ابتدائی طور پر ملاقات کے بعد بہت سی باتیں رفتہ رفتہ بعد میں معلوم ہوئیں، خصوصاً قیام پاکستان سے پہلے کا حال احوال۔ مثلاً یہ کہ کشفی صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۲؍ مارچ ۱۹۳۲ء ہے (خود ان کے بقول سن پیدائش ۱۹۳۰ء بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ اسکولوں مدرسوں وغیرہ میں داخلہ کے وقت اصل دن تاریخ سے دو تین سالوں کا فرق رکھنا اس زمانہ کا عام چلن تھا۔ اس کا تجربہ مجھے بھی ہے) یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کانپور کے رہنے والے ہیں اور ان کے والد گرامی اس وقت کے مشہور و معروف ادیب و شاعر جناب ثاقب کانپوری تھے نیز یہ بھی کہ وہ ۱۸ویں صدی کے مشہور بزرگ حضرت سیّد شاہ غلام رسول، رسول نما عرف دادا میاں کی خانقاہ بیگم گنج کے گدی نشین تھے (ان کے بعد کشفی صاحب تو گھر بار والدین بھائی بہن سب کو چھوڑ کر پاکستان چلے آئے تھے، اس لیے ثاقب صاحب کے جانشین اور صاحب سجادہ کشفی صاحب کے چھوٹے بھائی، ڈاکٹر سیّد ابوالحسنات حقی ہو گئے) اُردو، عربی، فارسی اور انگریزی کی بنیادی تعلیم کے بعد کشفی صاحب کا داخلہ حلیم مسلم کالج میں چھٹی جماعت میں ہوا پھر انٹر الہ آباد بورڈ سے کرنے کے بعد بی-اے کرائسٹ چرچ کالج سے کیا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ان کے (پڑوسی) اور خاص دوستوں میں جناب حسنین کاظمی تھے نیز گہرے دوستوں میں جناب سرشار صدیقی، جناب اشتیاق اظہر، جناب حنیف فوق صاحبان جیسے باکمال تھے۔ علاوہ ازیں تحصیل علمی کے پہلے مرحلہ میں ان کے ابتدائی ۸، ۱۰ سال کا زمانہ محنت و مشقت سے بھرپور، اور ذہنی و علمی بالیدگی کا زمانہ تھا جبکہ اگلا ۶، ۷ سال کا دور یعنی ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۷ء علمی و ادبی شاعرانہ سرگرمیوں اور اس وقت کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاسی ملی تحریکوں میں شرکت اور عملی طور پر جلسوں جلوسوں میں شرکت نیز تقریر و تحریر کی مصروفیت کے سبب حاضر دماغی، اور مطالعہ کی کثرت نے ان کی تعمیر شخصیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔

بہرحال کانپور کی فضاؤں میں رہتے ہوئے (تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر) بیگم گنج کے مکینوں سے بے خبری کے باوجود جب اپنے ممدوح سے ملاقات ہوئی تو گویا کانپور کی انجانی معصوم ''عصبیت'' جاگ گئی اور غیر محسوس طریقہ سے ''اپنائیت'' کا پیدا ہونا قابل تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ممکن ہے پہلی ہی ملاقات میں بے تکلفی اور اجنبیت محسوس نہ ہونا، شاید اسی لیے ہو۔ اس کا شاید ایک اور قرینہ بھی کسی درجہ میں کارفرما ہو۔ کشفی بھائی نوجوانی بلکہ جوانی کے عالم میں (کانپور جیسے بے صنعتی شہر میں) علمی ادبی سرگرمیوں کے علاوہ آزادی کی ملی تحریک میں حصہ لیتے رہے تھے۔

(۳)

پاکستان آنے کے بعد کشفی صاحب نے بی-اے آنرز اُردو میں سندھ یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس کیا اور اسی مضمون میں جامعہ کراچی سے ۱۹۵۲ء میں ایم-اے کی ڈگری اوّل بہ درجہ اوّل حاصل کی۔ (اس زمانہ میں ایم-اے کی کلاسیں کراچی کے مختلف کالجز میں ہوتی تھیں۔ کشفی صاحب اسلامیہ کالج میں طالب علم بھی رہے اور پھر استاد بھی۔ ان کے قریبی ساتھیوں میں جناب ڈاکٹر اسلم فرخی اور جناب وجد چغتائی بھی شامل تھے۔ جناب وجد چغتائی (م ۲۶ نومبر ۱۹۹۳ء) کہا کرتے تھے کہ کشفی ذہین بہت زیادہ ہیں اور اسلم کا حافظہ بے پناہ ہے)۔

شعبہ اُردو جامعہ کراچی سے بطور استاد کشفی صاحب ۱۹۵۹ء میں منسلک ہوئے۔ اسی دوران ۱۹۵۷ء میں طاہرہ بیگم سے ان کی شادی ہوگئی۔ (یعنی جو اُن کے دل میں آباد تھیں ان کے گھر آنگن میں آ گئیں)۔(۳) مگر خانہ آبادی کی رونقیں اس وقت اچانک خزاں رسیدہ ہوگئیں (جبکہ پرانی سبزی منڈی کے قریب یونیورسٹی روڈ پر) طاہرہ کشفی صاحبہ ٹریفک حادثہ کی زد میں آ کر (۲۳/اپریل ۱۹۶۳ء کو اپنے دو بچوں سمیت) داغِ مفارقت دے گئیں۔ کشفی صاحب کے دل جگر پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی؟ جو کچھ ہوا اس نقصان کا احاطہ الفاظ نہیں کر سکتے۔ ناقابل تلافی نقصان! کشفی صاحب جیسے جذباتی انسان نے ضبط و تحمل اور صبر و ثبات میں کمال کر دکھایا۔ واقعہ کے ایک ڈیڑھ ہفتہ بعد سرسری سی ملاقات آرٹس فیکلٹی کے قریب سڑک پر ہوئی، سوچا تھا، اظہارِ تعزیت میں یہ کہوں گا وہ کہوں گا۔ مگر واقعتاً سلام دعا کے بعد کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ملاقاتوں میں پھر ایک لمبا وقفہ آ گیا۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ موصوف عاکف میاں کے ساتھ امریکہ جا چکے ہیں۔ فروری ۱۹۶۸ء میں کولمبیا سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی میں ایم-اے کیا۔ واپسی کے فوراً بعد جامعہ کراچی میں نیشنل بینک کے برانچ منیجر کمال الدین صاحب مرحوم کے کمرہ میں ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں امریکہ میں کتاب خوانی کے ایک خاص طریقہ سے مطلع کیا اور بتایا کہ کسی کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ پڑھتے وقت نظروں کو سطر بہ سطر محدود نہ کیا جائے بلکہ نگاہ سے پورے صفحہ کا بیک وقت احاطہ کیا جائے تاکہ وہ چند لمحات میں چشم آشنا ہو کر فہم و شعور کی منزل سے ہمکنار ہو جائے۔ اس کا انہوں نے عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ بعد میں یہ تجربہ میرے بہت کام آیا۔ اور یہ خود دیکھا کہ گھنٹوں کا مطالعہ منٹوں میں ہونے لگا۔ کشفی صاحب عادتاً بھی وسیع المطالعہ شخص تھے اور عملاً بھی کسی کتاب، رسالہ، مضمون کو کم سے کم وقت میں پڑھ لیا کرتے تھے۔ اس لیے وہ چلتے پھرتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ پڑھنا ضروری خیال کرتے تھے، چاہے آگے جا کر وہ کسی سے ٹکرا جائیں یا دیوار ان کے قدم روک لے۔ مئی ر جون ۱۹۶۸ء میں میری فرمائش پر ایک مضمون ''اُردو میں سیرت نگاری'' لکھ کر دیا جو میری کتاب ''نقشِ سیرت'' کی زینت بنا۔ (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء)

(۴)

۱۹۶۸ء میں ہی کشفی صاحب کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ ان کا عقد ثانی ۱۹۶۶ء میں امریکہ جانے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ امریکہ سے واپسی (فروری ۱۹۶۸ء) کے چند ماہ بعد (جولائی ۱۹۶۸ء میں) رخصتی عمل میں آئی تو حضرت مولانا برکاتی کے بقول کشفی صاحب عائلی زندگی کی خوش نصیبی سے ہمکنار ہوئے۔ (موقع و محل کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں جو انہیں جانتے تھے۔ مولانا برکاتی سے زیادہ کشفی بھائی کو جاننے والے کم ہی ہوں گے) مولانا برکاتی کا قلم حقیقت رقم (مئی ۲۰۰۳ء) دونوں (ازواج ر ادوار) کا موازنہ اس طرح کرتا ہے:

> ''کشفی صاحب کی پہلی بیگم طاہرہ مرحومہ تھیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا لیکن کشفی صاحب کے قلب کا ایک گوشہ انہوں نے اب تک آباد کر رکھا ہے اور شاید ہمیشہ رہے''۔

پھر آگے رقمطراز ہیں کہ:

> ''کشفی صاحب کی موجودہ رفیقہ حیات بلقیس شاہین، جو مختلف جہات سے ایک مکمل اور معیاری شریک حیات ہیں، تعلیم اعلیٰ، ذوقِ ادب، ستھرا کردار، مطالعہ وسیع، اندازِ نگارش، کشفی صاحب سے زیادہ شگفتہ، اُن کے کردار کا ایک روشن و تابناک پہلو یہ ہے کہ وہ کشفی صاحب جیسے حساس، نازک مزاج شوہر کی مزاج شناس ہیں، مزاج شناس تو پہلے ہوں گی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب تو وہ کشفی صاحب پر حاوی ہیں۔ ہم سفر، ہم نوا، ہم قدم، ایک بار جاپان کا علمی سفر ساتھ کیا اور مکے مدینے کے پھیرے ساتھ ساتھ کیے''۔(۴)

یہ حقیقت ہے کہ طاہرہ بیگم کے بعد زندگی کا نیا سفر شروع کرتے وقت کتنے ہی اندیشے اُن کے سامنے ہوں گے۔ وہ اس وقت ۳۴ / ۳۵ سال کے جوان آدمی تھے۔ ان کی نفسی کیفیت، نازک مزاجی بلکہ تنک مزاجی، ایک ''شاگردہ'' سے مفاہمت، اور اگلی منزلوں کی مسافرت، سب کچھ اس وقت پردہ غیب میں تھا اور سب کچھ اللہ توکل نئے مسافر کے خلوصِ نیت، حوصلہ و ہمت لیکن سپردگی باہم پر منحصر تھا۔ وہ جو مشہور ہے کہ ''جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں'' تو بھائی کشفی اور بلقیس شاہین کا جوڑا شاید آسمانوں پر ہی بنا تھا جبھی اتنا مبارک ثابت ہوا۔ اور اُن کی جذباتی دنیا کی بے قرار بے اختیار بے کنار موجیں ساحل آشنا ہو گئیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نئے سفر میں ''نیا مسافر'' پرانے پر بازی لے گیا۔ اقدام انفعال بردار ہو گیا اور منفعل تقدم و تصرف کرنے لگا۔ چنانچہ ایک خاص ''گھریلو دوست'' کے مشاہدہ کے مطابق ''کشفی صاحب کے معمولاتِ زندگی میں تنظیم و ترتیب پیدا ہو گئی، ان کی علمی ادبی صلاحیتوں کو (جہت آشنا کر کے) دینی ادب کی طرف موڑ دیا گیا۔ بلکہ مخصوص کر دیا گیا یہاں تک کہ ان کی زندگی میں ایک پائیدار موڑ آ گیا اور شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔(۵) پھر کچھ عرصہ بعد ۱۹۷۰ء میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ تین سال کے لیے جاپان چلے گئے اور وہاں اوساکا یونیورسٹی کے شعبہ اُردو سے منسلک رہے۔(۶) جاپان جانے سے پہلے انکے ہاں ایک بیٹی (عاکفہ) پیدا ہوئی۔ اور ایک بیٹی جاپان کے قیام کے دوران (ثانیہ) پیدا ہوئی اور جاپان سے واپس پاکستان آ کر بھی اُن کے ہاں یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں (ثاقبہ اور ام ابیہا) پیدا ہوئیں۔(۷) جاپان سے واپس آنے کے بعد کشفی صاحب جامعہ کراچی کے شعبۂ اُردو سے پھر وابستہ ہو گئے۔ اب وہ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ڈاکٹر ہو چکے تھے۔ ان کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا: ''اُردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر (۱۷۰۷-۱۸۵۷)۔ ڈگری جامعہ کراچی نے ۱۹۷۱ء میں عطا کی۔

(۵)

۱۹۷۴ء میں کشفی صاحب (جاپان سے واپس آنے کے بعد) دوبارہ شعبۂ اُردو جامعہ کراچی سے وابستہ ہو گئے اور یہ وابستگی ۱۹۹۲ء میں ان کی ریٹائرمنٹ تک جاری رہی۔ یہ طویل دور ان کی زندگی کا بڑا اہم اور بھرپور مصروفیت کا زمانہ رہا بلکہ اس کو ایک جہت ساز زمانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، چنانچہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ کشفی صاحب بنیادی طور پر ایک استاد تھے اس لیے تعلیم اور تدریس ان کے فرائض منصبی میں شامل تھی، شعبہ میں تعلیمی تدریسی ذمہ داریاں ادا کرنے میں وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے، وہ طلباء و طالبات میں کافی مقبول تھے البتہ ذرا سخت، کم نمبر دینے والے اور موڈی مشہور تھے۔ کلاس کے لیے گھنٹہ منٹ کی پابندی اہم نہیں تھی۔ اگر طلباء نے ان کے سوالات کے جوابات دے کر ظاہر کر دیا کہ ان کے مضمون زیر بحث سے دلچسپی لے رہے ہیں اور آمادہ بہ ساعت ہیں تو کشفی صاحب کے معلومات کا دریا بہہ نکلتا اور موج در موج بہتا چلا جاتا چاہے اس میں گھنٹہ دو گھنٹہ گزر جائیں یا اور زیادہ۔ اور اگر طلباء نے اس کے برعکس بد ذوقی کا مظاہرہ کیا یا عدم دلچسپی دکھائی تو ایک دن یا زیادہ عرصہ کلاس لینے کا میلان پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنے مضمون کی گرفت، وسعت مطالعہ اور طلباء سے گہری دلچسپی، ہمدردی، خیر خواہی اور دوسروں کی مدد کرنے میں ان کی فیاضی پر کسی کو شک نہ تھا۔ تحقیق اور تنقید اُن کا اصل میدان تھا لیکن ادب قدیم ہو یا جدید، کلاسک ہو یا ماڈرن، شعر و شاعری ہو یا افسانہ، ڈرامہ، کہانی، خاکہ نگاری، انشاء پردازی، طنز و مزاح، نعت، نظم، غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ، ہائیکو، میر، غالب، اقبال، فیضی، کوئی مضمون ان کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ وہ دنیا کے ہر موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار رہتے تھے اور ہر ایک سے گفتگو کے لیے بلاتخصیص صنف آمادہ۔ جب صدر شعبہ کی ذمہ داریاں آ پڑیں تو انتظامی معاملات کا بوجھ بھی انہیں اٹھانا پڑا تاہم یہ اُن کے ذوق کی چیز نہ تھی۔

۲۔ اُن کے دینی مذہبی رجحانات اور روحانی میلانات اس دور میں نمایاں ہوتے چلے گئے۔ فکر و خیال کی جولانیاں اور قلم کی روانی شہ ہر دوسراً کی سیرتِ مطہرہ کے لیے وقف ہو گئی۔ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ کی روشنی میں سیرت رسول کے مختلف پہلوؤں پر مسلسل مضامین اشاعت پذیر ہوئے۔ ان کے ایک مقالہ ''حیاتِ محمدیؐ قرآن حکیم کے آئینے میں'' کو ۱۹۹۱ء میں قومی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں اولین رحمۃ للعالمین کانفرنس دہلی میں اپنی اہلیہ کے ساتھ شرکت کی، جہاں ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی۔ اس اجلاس میں شریک حیات کی عمدہ تقریر کو بہت سراہا گیا۔(۸) باطنی رجحانات کی تبدیلی کے ساتھ کشفی صاحب کے ظاہری سراپا میں بھی تبدیلی اسی دور میں ہوئی۔ پہلے وہ صفا چٹ کلین شیو تھے لیکن ۸۰ کی دہائی میں (غالباً ۱۹۸۷ء کے لگ بھگ) داڑھی رکھ لی۔ گویا صوفی با صفا ہو گئے۔ لباس میں کسی خاص تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ شیروانی، کرتا پاجامہ پہلے بھی پہنا کرتے تھے۔ بعد میں شیروانی کی جگہ واسکٹ نے لے لی۔ لباس عام طور پر سفید، کرتا پاجامہ، قمیض شلوار، واسکٹ، رنگین کالی یا سلیٹی وغیرہ زیب تن کر لیتے تھے۔ (تصنع تکلف کے بغیر جیسے سیدھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سادے مسلمان وہ تھے، ویسے نظر آتے تھے)

۳۔ زیارت حرمین کی (اہلیہ کے ساتھ) سالانہ حاضری نے اسی دور میں گویا ضابطہ کی سی شکل اختیار کر لی۔ جسے انہوں نے بعد میں بھی آخر عمر تک نبھایا۔ عمرہ کی ادائیگی کے علاوہ شہر دل آرام مدینہ کی زیارت، مواجہ شریف پر حاضری اور گنبد خضرا کے نظارے انہیں بے حد عزیز، انکی تمنا، ان کی آرزو ''نسبت'' کا تقاضا تھے۔

۴۔ پروفیسر حسنین کاظمی کشفی صاحب کے بچپن کے دوست، پڑوسی اور بہت قریب سے جاننے والے ہیں، انہوں نے اپنے کلمات خیر میں لکھا ہے کہ ''ایک اور کرم اور سب سے بڑا کرم اللہ نے ان پر یہ کیا کہ ان کے قلب و نظر میں جذبہ عشق رسول اللہ ﷺ سے سرشاری کی امنگ پیدا کر دی ہے۔ ع یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر اور اپنے رسول ﷺ کے در پر حاضری کے انہیں بھرپور مواقع عطا کیے اور ہر موقع ان کے لیے سوغات بنا۔ آگے لکھتے ہیں کہ ''مجھے یقین ہے کہ عشق رسالت مآب ﷺ کا یہ گہرا کیف ابوالخیر کشفی کو وراثت میں ملا ہے اور اس سے زیادہ قیمتی وراثت کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔(۹) وہ مزید رقمطراز ہیں کہ ''جذبہ عشق رسول اللہ ﷺ نے ان کو نعت گوئی کی سعادت سے بھی نوازا ہے اور سیرت رسول کریم ﷺ پر کتابوں اور مضامین کی صورت میں وہ قابل قدر کام بھی کر رہے ہیں۔(۱۰)

۵۔ نعت سے ہر طرح کی دلچسپی اور نعت گوئی کا شوق پرانا تھا۔ اُردو نعتیہ شاعری کا انتخاب ''نقش سعادت'' کے عنوان سے مرتب کر کے وہ جولائی ۱۹۶۶ء میں طاہرہ کتاب گھر کراچی سے شائع کر چکے تھے۔ (اس سے متاثر ہو کر خاکسار راقم الحروف کا مرتبہ مجموعہ نعت و سلام ''نوائے سروش'' جمعیت الفلاح نے ربیع الاوّل ۱۳۸۷ھ میں شائع کیا تھا)۔(۱۱) دور زیر بحث میں کشفی صاحب نے نعت گوئی کی طرف کافی توجہ کی چنانچہ ''نسبت'' کے زیر عنوان ان کا مجموعہ نعت اقلیم نعت کراچی نے ۱۹۹۱ء میں شائع کیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے مختلف کتابوں کے دیباچے اور پیش لفظ اور رائے، تأثرات وغیرہ کی شکل میں بہت کچھ لکھا جس کی ایک فہرست جناب صبیح الدین رحمانی نے اپنی مرتبہ کتاب ''نعت نگر کا باسی'' میں شامل کر دی ہے۔(۱۲) اس کے بعد بھی اگلے سالوں میں وہ نعت اور نعت نگاری، نعت شناسی کے حوالہ سے جو کچھ لکھتے رہے، ان مضامین کا مجموعہ ''نعت اور تنقید نعت'' کے عنوان سے طاہرہ کشفی میموریل سوسائٹی کی طرف سے ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(٦)

غیبت کرنا عام لوگوں کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے لیکن کشفی بھائی پیٹھ پیچھے ''اچھائی'' بیان کرنے کے خوگر تھے، اس کا ذاتی تجربہ مجھے کئی بار ہوا۔ انتہائی صاف گو ہونے کے باوجود میرے سامنے انہوں نے یہ کبھی نہ کہا تھا کہ فلاں کام تم نے اچھا کیا یا فلاں برا۔ اس لیے بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں یا میرے علمی کام کی ان کے نزدیک کیا قدر و قیمت ہے۔ غالبًا ۱۹۸۲ء میں وہ لاہور گئے تو واپس آ کر مجھے بتایا اور پھر اچانک مجھ سے کہنے لگے کہ ''ایڈیٹر نقوش محمد طفیل صاحب کا خط آئے گا تم اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ان کو بھجوا دینا''۔ بس یہ کہا اور چلے گئے۔ دوسرے تیسرے دن طفیل صاحب کا مقالہ طلبی کے لیے خط واقعی آ گیا۔ انکے خط سے اتنا معلوم ہوا کہ وہ اسے نقوش رسول نمبر میں چھاپنا چاہتے ہیں۔ مقالہ بھیج دیا گیا اور پھر وہ نقوش رسول نمبر کی پانچویں جلد کا حصہ بنا۔ طفیل صاحب مرحوم و مغفور نے از راہِ کرم مذکورہ مقالہ کی کچھ اضافی کاپیاں مجلد کرا کر الگ سے مجھے بھیجیں تو اس کا پہلا صفحہ اُن کی بے ساختہ تحریر ''طلوع'' سے مزین تھا۔ طلوع سے یہ اطلاع ملی کہ میرے بارے میں بھائی کشفی صاحب نے اُن سے کیا کہا تھا؟ وہ کہتے ہیں: ''جناب ابوالخیر کشفی کراچی سے تشریف لائے تو مجھے بھی شرف نیاز بخشا، گفتگو یوں شروع ہوئی۔ کیا کر رہے ہو؟ کیا چھاپ رہے ہو؟ جواباً بتاتا رہا یہ کچھ کر رہا ہوں۔ یہ کچھ چھاپ رہا ہوں، اچھا تو رسول نمبر چھاپ رہے ہو! جی ہاں! ''اگر ہم ایک طویل مقالہ اسلامی ریاست کے بارے میں دلوائیں جو ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے معیار کا ہو تو کیا انعام دو گے؟ میں ڈاکٹر محمد حمیداللہ کے نام سے چونکا پھر ان کے سے معیار کا مقالہ، مزید چونکا۔ جھٹ مقالہ نگار کا نام پوچھا۔ ڈاکٹر نثار احمد! یقین کیجئے مجھ پر نام کا کچھ زیادہ رعب نہ پڑا۔ میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کو جانتا تھا جو دہلی یونیورسٹی میں عربی کے اُستاد ہیں مگر میں اس ڈاکٹر نثار احمد سے واقف نہ تھا جو کراچی یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کے استاد ہیں۔ پھر بھی میں نے مسودہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مسودہ میرے پاس پہنچ گیا، خاصا بڑا مسودہ تھا، ایک دم پڑھا نہ جا سکتا تھا مگر ہم ایڈیٹر لوگ چند منٹوں میں اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ مضمون نگار پاتال کی خبر لایا ہے کہ نہیں!

جب یہ یقین ہو گیا کہ کام کا مسودہ ہاتھ لگا ہے تو سارے کام چھوڑ کر مسودہ پڑھا۔ جتنا پڑھتا جاتا تھا حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مسودہ پڑھتے وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ کوئی ستارہ نہ تھا، دیکھتے دیکھتے ایک ستارہ نمودار ہوا۔ پھر وہ ستارہ چاند بن گیا۔ پھر چاند نے آسمانِ ادب و سیرت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منور کر دیا''۔

آج کے خود غرض، بے مہر معاشرے، خود غرض دنیا، ہر چیز کی قیمت وصول کرنے والے تاجروں اور ہر معاملہ میں مفادِ ذاتی کے نگران ذخیرہ اندوزوں کے ہجوم میں کشفی بھائی جیسا بے غرض، بے نفس آدمی اب دوسرا کاہے کو ملے گا۔ وہ خود چونکہ ابوالخیر تھے، اس لیے ستائش کی کسی تمنا اور صلہ کی کوئی پروا کیے بغیر کلمہ خیر کہہ گئے، جس کا سننے والا خود ایسا قدردانِ عالی شان نکلا کہ ایک عزلت نشیں، بے مایہ شخص کو سرِ انجمن لے آیا۔

پھر خاکسار کے حق میں کشفی بھائی کا ذرا سا زبانی تعارف برادرم طفیل صاحب سے اس کے طویل تحریری تعلقات اور چند بے تکلفانہ ملاقاتوں کا ایسا بہانہ بن گیا کہ سالوں نہ بھائی طفیل صاحب نے اپنی بے ساختہ تحریری عنایات سے اس ناچیز کو محروم کیا اور نہ اس حقیر فقیر نے جوابی بے تکلفی سے عذر برتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۶-۱۹۸۵ء تک کئی سالوں میں درجنوں خطوط کا دونوں طرف سے تبادلہ ہوا۔ حقیقت حال سے مطلع کر کے اس خط و کتابت کی پوری فائل میں نے کشفی صاحب کو پیش کر دی۔ بہت خوش ہوئے اور ایک ڈیڑھ ہفتہ میں ہی بالاستیعاب مطالعہ کر کے خطوط کی عکسی نقول پر جگہ جگہ سرخ پنسل سے نشان لگا دیئے کہ اشاعت کی صورت میں تحریر کے کون کونسے حصے شامل کیے جائیں گے اور کون سے حذف۔ نیز کہاں کہاں نوٹ کی ضرورت ہوگی اور کہاں کہاں اختصار یا تشریح کی۔ مزید برآں پوری طرح موڈ میں آ کر بطور پیش لفظ فائل کے ایک طرف مفصل نوٹ بھی تحریر کر دیا۔ کہنے لگے خط و کتابت کے اس مجموعہ کی تاریخ ادب میں خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کاتب اور مکتوب الیہ دونوں کی تحریریں یکجا ہیں۔ یہ مجموعہ ہنوز منتظر اشاعت ہے۔

۱۹۹۲ء میں شعبہ اسلامی تاریخ کی طرف سے یوم آزادی پاکستان کی مناسبت سے بعض تاریخی نادر دستاویزات کی عکسی نقول اور طلباء و اساتذہ کے مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ ''صحیفہ آزادی'' کی تقریب ہوٹل جبیس کراچی میں رکھی گئی تھی۔ تقریب کے مہمان خصوصی جناب حکیم محمد احسن صاحب (سابق میئر کراچی، جنھوں نے ماری پور کے ہوائی اڈہ پر قائداعظم کا استقبال کیا تھا) مدعو تھے۔ دیگر مہمانان میں مولانا حسن مثنی ندوی، شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر ارتفاق علی، ڈاکٹر محمد سلیم صاحب سابق صدر شعبہ اسلامی تاریخ شامل تھے۔

اس تقریب کا پروگرام (کشفی صاحب کے گھر پر بیٹھ کر ان کی مشاورت سے) طے کیا گیا اور چونکہ یہ خاکسار بطور صدر شعبہ اسلامی تاریخ میزبان تھا اور اسے شعبہ کی طرف سے مہمانانِ گرامی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خدمت میں یادگاری شیلڈ پیش کرنا تھیں۔ اس سلسلہ میں بطور سند جواز مختصر تعارف ضروری تھا۔ چنانچہ کشفی بھائی نے مذکورہ مہمانوں کا مختصر تعارف قلم برداشتہ لکھ کر میرے حوالہ کر دیا۔ (یہ نشست تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ کی تھی اس وقت غالباً وہ ریٹائر ہو چکے تھے) افسوس کہ پختہ وعدہ کے باوجود کشفی بھائی اس تقریب میں شریک نہ ہو سکے، ورنہ اُن کے ''کلمات خیر'' سے ہم مستفید ہوتے اور وہ خود مشاورت کے ''ثمرات'' اور تقریب کا بخیر و خوبی انجام ضرور دیکھ لیتے، پھر شعبہ اسلامی تاریخ کے ۴۰ سال مکمل ہونے پر خاکسار نے شعبہ کی ۴۰ سالہ تاریخ کو ایک کتابی شکل میں الایام کے نام سے مرتب کیا تو اس کی تقریب رونمائی ۱۹۹۳ء میں سوک سینٹر کے کانفرنس ہال میں منعقد کی جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر ارتفاق علی صاحب نے فرمائی، تقریب کے مہمان خصوصی مشہور عالم فاضل ماہر قانون جناب خالد ایم اسحاق صاحب تھے۔ مجھے خوشی اس وقت ہوئی جبکہ کشفی بھائی اس تقریب میں تشریف لائے اور گویا گزشتہ تقریب میں اپنی عدم شرکت کا مداوا کر کے شکرگزار کیا۔

(۷)

کشفی بھائی نے میری لوح دل پر اپنے خلوص، ہمدردی، خیرخواہی، قدردانی اور اللہ واسطے کی محبت کا ایک اور نقش اس وقت مرتسم کر دیا جبکہ ۲۰۰۵ء کی ایک صبح دو اجنبی مہمانوں کے ساتھ برادرم پروفیسر زاہد محمود صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور مدعا یہ بتایا کہ ایک (یوسف زئی) صاحب نے ''تقویم عہد نبوی'' پر جو کام کیا تھا اسے جلد سے جلد زیور طبع سے آراستہ کرنے کے لیے مسودہ کی تصحیح اور نظرثانی کرانا چاہتے ہیں۔ خاکسار نے عرض کیا کہ: میں ''یوسف زئی'' صاحب کو نہیں جانتا۔ کام بہت مشکل، ذمہ داری کا اور تکنیکی مہارت کا متقاضی ہے اور اس قسم کا ایک کام حیدر آباد سندھ کے ایک ''خان صاحب'' ۱۵/۲۰ سال پہلے کر رہے تھے، وہ یہاں میرے غریب خانہ پر بھی بغرض مشاورت تشریف لائے تھے اور کچھ عرصہ بعض تقویمی معاملات پر خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ معلوم نہیں پھر ان کا اور ان کے کام کا کیا ہوا؟ انہوں نے شاید ایک دیباچہ یا مقدمہ وغیرہ بھی مجھ سے لکھوایا تھا۔ اس کے بعد جب میں نے مسودہ دیکھنے کا عندیہ ظاہر کیا تو حیرت در حیرت کا سامنا ہوا۔ ایک حیرت تو یہ ہوئی کہ ''تقویم عہد نبوی'' کے مؤلف وہی خان صاحب نکلے جن کا حوالہ خاکسار نے دیا تھا (جبکہ موصوف کے خاندانی لاحقہ کا علم مجھے نہ تھا) دوسری حیرت یہ ہوئی کہ ۱۵ / ۲۰ سال بعد گھوم پھر کر وہی کام پھر میرے سامنے آ گیا، جسے میں نے دیکھا تھا، علاوہ ازیں پیش کردہ مجلد مسودہ کے ابتدائی صفحات میں اس حقیر فقیر کا ''مقدمہ'' بھی حسب سابق موجود تھا۔ یعنی اجنبی مہمانوں اور راقم الحروف دونوں کی منزل ایک نکلی۔ اس ''متاع گمشدہ'' کی دریافت نو پر خوشی ہی نہیں، اپنائیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا سرور بھی تھا۔ عقدہ یہ کھلا کہ جناب مؤلف موصوف (علی محمد خاں یوسف زئی صاحب) کا پتہ اس لیے نہ چل سکا کہ وہ حیدر آباد (سندھ) سے ہجرت کر کے (۱۵ر ۲۰ سال پہلے) انگلستان اپنے لائق فرزند (ڈاکٹر نور محمد یوسف زئی صاحب) کے پاس چلے گئے تھے (تا آنکہ وہیں موصوف کا ۱۹۹۷ء میں انتقال ہو گیا) اب وہی فرزند دلبند اپنے والد مرحوم کی ''یادگار'' کو منصۂ شہود پر لانا چاہتے ہیں۔ جبکہ میرے پاس آنے والے اجنبی مہمانوں میں سے ایک خاتون ان کی سالی صاحبہ اور دوسرے صاحب ان کے پرنٹر تھے۔ یہ حیرت باقی تھی کہ وہ اجنبی مہمان اس حقیر فقیر کے پاس کیسے پہنچے؟ اس استفسار کا جواب مہمانوں نے یہ دیا کہ وہ لوگ دراصل بھائی کشفی صاحب کے پاس ہی گئے تھے مگر انہوں نے ''غائبانہ تعریف فرما کر ہمیں آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔ اس کا تحریری ثبوت انہوں نے پیش کر دیا۔ مجلدہ کے پشت صفحہ پر تحریر تھا کہ: ''ڈاکٹر نثار احمد صاحب سے اس کی تصحیح و نظرثانی'' مناسب معاوضہ پر کرا لی جائے''! مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد شام کو میں نے کشفی بھائی کو ٹیلیفون کے ذریعے اطلاع دی اور عرض کیا کہ فقیر کے ناتواں شانوں پر اتنا بوجھ کیوں؟ آپ کرتے تو شایانِ شان ہوتا! جواباً ارشاد ہوا، ''تم بہرحال یہ سب مجھ سے زیادہ جانتے ہو، تم ہی کرو، یہی بہتر ہوگا۔ رہا معاوضہ! تو تم خود ان کو جو مناسب سمجھو بتا دو!! خاموش محبت، آرزو مندی، حوصلہ افزائی اور بے نیازی!! سب جذبوں کا عکس الفاظ کے پیچھے موجود تھا! خدا کے فضل و کرم سے سال بھر کے اندر ۲۰۰۶ء میں ''تقویم عہد نبوی'' زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم کے حلقوں میں پہنچ گئی۔ کشفی بھائی کا مان تھا پورا ہوا، مجھے بھی اطمینان ہوا۔

(۸)

یہ بھی اسی سال ۲۰۰۵ء کا واقعہ ہے۔ اس خاکسار راقم الحروف کی ایک کتاب ''خطبۂ حجۃ الوداع'' چھپ کر آئی تھی۔(۱۳) اس کی کچھ کاپیاں، مقابلہ کتب سیرت میں شامل کرنے کے لیے وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان کو ارسال کی گئیں۔ مقررہ طریقہ کار کے مطابق بطور نتیجہ اس کتاب (خطبۂ حجۃ الوداع) کو وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان اسلام آباد کی جانب سے اوّل انعام کا مستحق قرار دیا گیا (سند امتیاز اور انعام وزیر مذہبی امور جناب اعجازالحق نے عطا فرمایا) یہ کتاب ابتدائی طور پر چونکہ مقالہ کی شکل میں ششماہی السیرہ عالمی کے کئی شماروں میں بالاقساط شائع ہو چکی تھی اور ہمارے ممدوح اس مجلّہ کی مجلس مشاورت کے رکن اور سرپرستوں میں شامل تھے، اس لیے اغلباً مقالہ کے مضامین کشفی صاحب کی نظر سے بھی گزرے ہوں گے تاہم اس کے بارے میں آنجناب نے کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا تھا۔ البتہ کتابی شکل میں آنے کے بعد بہت خوش ہوئے اور فرط محبت سے سرشار ہو کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود ہی فرمایا کہ ''اس پر تبصرہ میں لکھوں گا''۔ چنانچہ انہوں نے بلاتاخیر ''السیرۃ'' کے آنے والے ۱۴ ویں شمارہ (رمضان ۱۴۲۶ھ / اکتوبر ۲۰۰۵ء) میں (۲۵ سطروں پر مشتمل) اپنا تبصرہ تحریر فرمایا۔ خطبہ جلیلہ کو پہلی مرتبہ باقاعدہ عالمی انسانی منشور کی حیثیت سے مرکزی و ذیلی دفعات مع افتتاحیہ و اختتامیہ پیشکش پر کشفی بھائی نے ناچیز کی کوششوں کو ایک ''علمی کارنامہ'' قرار دیا۔ بہرحال اس کام کی حیثیت جیسی کچھ بھی ہو مگر یہ دیکھیے کہ آدمی کا دل بڑھانے کے لیے ایک جملہ بھی کتنا اہم اور ثمربار ہوتا ہے۔ حوصلہ افزائی اور قدردانی کے لیے بجائے خود حوصلہ اور ظرف چاہیے۔ حوصلہ مندوں اور ظرف والوں کے چلے جانے سے کچھ نہیں ہوتا بس ذرا تاریکی اور سائے بڑھ جاتے ہیں!

(۹)

جو لوگ کشفی صاحب کے قریب رہے وہ یقیناً اُن کو زیادہ جانتے ہوں گے۔ میں نے تو ذرا دور سے دیکھا، پہلے وہ شہر سے بارہ میل پرے جامعہ نگر میں رہتے تھے لیکن ملاقات جامعہ میں ہی ہو جاتی تھی اس لیے اُن کے گھر ایک دو مرتبہ ہی جانے کی ضرورت پڑی) پھر وہ گلشن چلے گئے اور پھر بفرزون اور آخر کار سب سے زیادہ دور مسجد عائشہ کے پاس ڈیفنس میں جا بسے اہل خانہ کے ساتھ۔ یہ بعد مکانی تو ہے لیکن تعلق خاطر کے لیے ایسے فاصلوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔ ''اپنے'' چاہے جتنے ہی دور ہوں، مگر یہ سہارا یہ اطمینان سا ہوتا ہے کہ دسترس میں ہیں، کہیں نہ کہیں بہرتقریب مل جائیں گے۔ (۴۵/۴۰ سال اسی طرح گزر گئے) لیکن جب یہ آس نہ رہے اور طے ہو جائے کہ ''یاروں نے دور جا کے بسا لی ہیں بستیاں! تو عجیب وحشت گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ آس پاس ایک خلا سا ہو جاتا ہے جسے پر نہیں کیا جا سکتا۔ کشفی بھائی کے جانے کے بعد وہ خلا اب محسوس ہوتا ہے۔ عجیب سا احساس! پتہ نہیں یہی بات تھی یا کچھ اور کہ میں بھی ''دل'' کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہسپتال میں (CCU) میں جا پہنچا، وہاں عجیب بات یہ تھی کہ برابر کا مریض وینٹی لیٹر پر تھا جو اسی رات چل بسا، مجھے کشفی بھائی بہت یاد آئے۔ مختلف آلات کی نلکیاں مختلف حصوں پر لگی تھیں تاکہ میری حرکت ''محدود'' رہے اور سمجھ لیا جائے کہ ع بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!!

(۱۰)

کشفی صاحب سے کسی نوع کا تعلق رکھنے والا شاید یہ محسوس کر سکے گا کہ زندگی کے عام بلکہ تمام معاملات میں پوری طرح مشغول و منہمک بلکہ ملوث رہنے کے باوجود ایک طرح کی بے رخی، ایک درجہ بے نیازی کا تأثر اُن کے رویہ سے ضرور اخذ کیا جا سکتا تھا۔ کبھی یہ اچانک صادر ہو جاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کبھی غیرمحسوس طور پر ذرا دیر میں سامنے آتا۔ بادی النظر میں وہ عوام الناس سے الگ کوئی چیز نہ تھے بہت سی خوبیاں بہت سی خامیاں، جو سب میں ہوتی ہیں ان میں بھی تھیں۔ چنانچہ ڈاکٹر یونس حسنی کا ''شعلہ و شبنم کا آمیزہ'' صد فی صد درست ہے۔(۱۴) ان کے اندر کا موسم، وقفوں کے ساتھ بدلتا چلا گیا۔ ایک تبدیلی عقد ثانی کے بعد بلکہ رخصتی کے بعد آئی۔ (یہ ضروری اور ناگزیر تھی) نیز ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہوائیں فضائیں پھر بدلیں، جب سال بہ سال، ''وطن سے وطن تک'' کا سفر شروع ہوا۔ (وہ حسرت موہانی سے بہت متاثر تھے۔ ان کا یہ شعر انہیں حسب حال محسوس ہوتا کہ ؎

جب دور سے وہ گنبد خضریٰ نظر آیا
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آیا

حسرت موہانی بھی ہر سال حرمین شریفین زیارت کے لیے جاتے تھے، جب لوگ پوچھتے کہ آپ ہر سال حج کے لیے کیوں جاتے ہیں تو مولانا بڑی سادگی سے فرماتے کہ ''میں تو اپنے جد امجد کے روضے پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں، راستہ میں مکہ بھی آ جاتا ہے تو حج بھی کر لیتا ہوں، ورنہ زندگی میں حج ایک بار فرض ہے)۔ کشفی صاحب کا جواب کیا تھا نہیں معلوم۔ مگر ہاں جب میں اُن سے پوچھتا کہ آپ تو ہر سال جاتے ہیں، وہاں کہاں ٹھہرتے ہیں؟ کوئی خاص جگہ، کوئی خاص ہوٹل، تو جواب میں کہتے کوئی خاص مقرر نہیں، کبھی کہیں کبھی کہیں۔ مولانا حسرت کی طرح کشفی صاحب کو بھی خاندانی نسبت تو حاصل تھی جو آخر میں زیادہ احساس، اقرار اور اعلان کے درجہ میں آ گئی:

غم جہاں سے یہ کہہ دے مری طرف سے کوئی
میں آج اسم محمدؐ کے سائبان میں ہوں
زماں، مکاں پہ تسلط مرے نبیؐ کا ہے
غریب شہر ہوں اور اپنے ہی مکان میں ہوں
سلام جس کو کریں ہفت آسماں کشفی
اس کا خون ہوں اور اس کے خاندان میں ہوں

ان کے والد جناب ثاقب کانپوری نے بھی کبھی کہا تھا: ؎

کروں نہ شکر تو ثاقب کفر نعمت ہے
خدا کا شکر کہ ہوں ہاشمی و مطلبی

زیارت حرمین کا اثر ان کے اندرونی منظر کو بدلنے کا باعث ہوا: ؎

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب گنبد خضریٰ کے سوا عکس نہ منظر
آنکھوں میں محبت کا بیاں لے کے چلا ہوں
ہر قید زماں اور مکاں مری نخچیر
جو زندہ رہے اب وہ سماں لے کے چلا ہوں

ریٹائرمنٹ کے بعد داخلی خارجی دونوں دائروں میں ''آب و ہوا'' کی تبدیلی کے جو اثرات روبہ عمل آئے وہ قابل تعجب نہیں ہو سکتے۔ جو لگن پیدا ہو چکی تھی، جو ان کے لہو میں آرزو میں زندہ تھی جو جستجوئے مسلسل، انہیں بے چین رکھنے لگی اور جس کی راہ میں، کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی تھی۔ نعت گوئی کا فیضان و میلان فزوں تر ہو گیا۔

وقت کے جبر سے بالا ہوں رسولِ اکرمؐ
میری ہر شام و سحر آپؐ سے وابستہ ہے
یہ زر و مالِ، جہاں میرا حوالہ ہی نہیں
میرا اندازِ نظر آپؐ سے وابستہ ہے

ایک طرف ان کا ذاتی میلان، بیدار دل، تابندہ ذہن ''مسافرت'' کا لذت آشنا ہو گیا۔ دوسری طرف جدّی پشتی گدّی بردار، خانقاہی پس منظر، مگر نہ دکھاوا نہ ظاہر داری، نہ ہیئت ظاہری میں، جوگی، نہ قلندر، نہ مجذوب، بس سیدھے سادے شریف آدمی، کہا تو چھوٹے بھائی ابوالحسنات حقی نے مگر ان پر صادق آیا۔ ع

نہ قطب ہوں نہ قلندر نہ کوئی دوسرا وصف
کوئی تو آئے کہے دیکھو آدمی یہ ہے

مطلب یہ ہے کہ پاک دلی، پاک بازی کی صلاحیت بالقوہ بھی حاصل تھی اور بالفعل بھی۔ نسبت سادات کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے کہ ''مال و متاع'' ورثہ میں بھی ملا وہ چھوٹے بھائی ابوالحسنات کے بقول: ماں کا گداز قلب اور باپ کی حق گوئی و بے باکی۔(۱۵) بس ایک آنچ کی کسر جو رہ گئی تھی وہ شریک حیات کی چالیس سالہ رفاقت پیہم نے پوری کر دی۔ عینی گواہ اور دیور (ابوالحسنات) کا بیان ہے کہ ''بھابی میں جو شعور و دانائی ہے وہ جذبہ سے خالی نہیں بلکہ جذبہ کی سطح کو بلند کرنے والی ہے۔ گھر باہر اور اندر کے مسائل پر سرگوشیوں میں عاقبت، روشن کرنے والی شخصیت بھابی کی ہے۔ بھائی جان، اُن کا دل دعاؤں میں اور زبان سرزنش میں مشغول رہتی ہے۔ عورت دل اور زبان کی یکجائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ماہر ہوتی ہے، کچھ ایسی ہی ہیں بلقیس شاہین''۔(۱۶) چنانچہ آثار بتاتے ہیں کہ آں محترمہ نے کشفی صاحب کی زندگی میں آ کر انہیں بکھرنے سے بچا کر مجتمع رکھا۔ اُن کے ہر لمحہ کو راحت افزا بنانے کے لیے ایثار، فیاضی، عالی حوصلگی سے کام لیا اور ''بہ خاطر احباب'' دل بڑا کر کے اس نام کے ساتھ رہنا گوارا کر لیا جو کسی کے لیے قرارِ دل و جاں ہو تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے چاہا جائے وہ بھی بیزاری سے نہیں، مہر و لطف کے ساتھ! راہِ سلوک میں یہ سپردگی سالک کو منتہائے قرابت کی منزل تک پہنچا کر رہتی ہے۔

چوڑی بجتی ہے تو برکت کی صدا آتی ہے
مرضیٔ شانِ ھدیٰ رنگ حنا میں شامل
کسی نقاب کے دامن میں جگنوؤں کی چمک
حیا و عفت و ایمان کی ترجماں بن کر
بلقیس کے ہونٹوں پہ ترے نام کا نغمہ
اس پر بھی عنایت کی نظر سیّد عالمؐ
کعبہ کے مقابل تجھے دیکھا ہے نظر نے
ہاں ربِ محمدؐ کی عطا تیرے لیے ہے
ماؤں کی ردا سایۂ الطافِ الٰہی
صدیق کی بیٹی کی حیا تیرے لیے ہے
ہر لمحہ ترے لب پہ درود اور ثناء ہے
خاصانِ محمدؐ کی دعا تیرے لیے ہے
بلقیس بھی کشفی بھی پریشان ہیں دونوں
اب ربِّ محمدؐ کی عنایت پہ نظر ہے

(۱۱)

ہر سال کی طرح اس سال بھی کشفی صاحب عمرہ و زیارت مدینہ (جسے وہ کہتے ہیں ''مدینہ شہر نہیں ہے مری تمنا ہے'') کے لیے ''ارادوں'' کا احرام باندھ چکے تھے اور سراپا انتظار میں، تھے کہ بلاوا آیا ہی چاہتا ہے۔

مرے سرکار نے پھر مجھ کو بلایا ہوگا
ایک پیغام لیے بادِ صبا آتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلاوا تو آیا مگر شہر خوباں کا نہیں بلکہ ''ربِ محمدؐ'' کا بلاوا۔ اس کا بہانہ یہ بنا کہ طبیعت خراب ہوئی اور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ آخرکار اس سفر کا وقت آگیا جس میں نہ تقدیم ہوتی ہے نہ تاخیر۔ ۱۵ مئی ۲۰۰۸ء۔ وہی احرام والا لباس سفید دو چادریں اور خوشبو۔ مسافر مگر تنہا! توشۂ اعمال کے ساتھ۔ اور پھر دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا؟ چند ہی گھنٹوں میں، وہ مسافر وہاں جا سویا۔ جہاں بہت سے پیارے سبز درختوں، پتوں، ٹہنیوں اور پھولوں کے درمیان محو آرام ہیں۔ جہاں اُن کے استاد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور میرے استاد ڈاکٹر امیر حسن صدیقی جیسے سائبان لوگ ان کے پڑوس میں آنے سے خوش ہوئے ہوں گے۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے، ان کے ساتھ امن و عافیت کا معاملہ کرے۔ عذابِ قبر سے محفوظ فرما کر جنت کی ہوا اور اپنی رضا سے متمتع فرمائے، آمین۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ دیکھیے، خورشید احمد۔ اسلامی نظریہ حیات، اشاعت یازدہم، کراچی یونیورسٹی، کراچی 1995ء، دیباچہ طبع سوم۔ مصری

۲۔ دارالعلم والتحقیق کے تحت یہ پہلا یادگاری خطبہ تھا جسے بعد میں اسلام اور مغرب کے نام سے زوار اکیڈمی پبلی کیشنز نے کتابچہ کی صورت میں شائع کیا۔

۳۔ کشفی صاحب کے چھوٹے بھائی جناب سیّد ابوالحسنات حقی رقم طراز ہیں: ''پاکستان جانے والے قافلوں میں حاجی عبدالغفور صاحب بھی تھے جنھیں ہم لوگ چچا کہتے تھے، ان کی بیٹی طاہرہ بھی تھیں۔ ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ یہ لوگ رؤسائے شہر میں سے تھے۔ اس زمانہ میں ہندو مسلمان رئیسوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ انگلیوں پر گن لیے جاتے تھے۔ مجھے پتہ لگا کہ بھائی جان کو ان سے اتنی موانست ہے کہ وہ طاہرہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں، والد صاحب کو بھائی جان کی تمنا کا علم ہوا۔ مسئلہ قرشیت ایک بار پھر ابھر کر سامنے آیا، میں بہرحال بھائی جان کے ساتھ تھا۔ طویل خط دکتابت نے والد صاحب کو سپرانداز کر دیا۔ مسئلہ کلام پاک کی اس آیت نے طے کر دیا۔ ﴿فانکحوا ما طاب لکم من النسآء﴾ (نکاح کرو عورتوں سے تم اپنی پسند کی) غالباً اپنی وکالت میں بھائی جان کا یہ آخری خط تھا جس میں انہوں نے مندرجہ بالا آیت کا حوالہ دیا تھا۔ شادی ہوئی والد صاحب شریک ہوئے، واپسی پر کہنے لگے ایسی پڑھی لکھی لڑکی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔ (بلقیس شاہین، کشفی صاحب مزید آپ کے لیے، زین پبلیکیشنز، طاہرہ میموریل سوسائٹی، کراچی ۲۰۰۶ء۔ سیّد ابوالحسنات حقی، میرے بھائی جان، ص ۸۳، ۸۴) ۵۹-۱۹۶۰ء کی دہائی میں یہ بات سننے میں آئی تھی کہ کشفی صاحب نے غلام احمد پرویز کے ساتھ لغات القرآن میں مددگار کے طور پر کام کیا تھا اور انہوں نے اپنی منہ بولی بیٹی طاہرہ سے ان کی شادی کر دی۔ یہ گویا محض افواہ تھی)۔

۴۔ بلقیس شاہین، کشفی صاحب آپ کے لیے۔ نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز، کراچی، ۱۲ مارچ ۲۰۰۴ء (بھولے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذہین، محمود احمد برکاتی، ص ۱۰، ۱۱)

۵۔ ایضاً (فہیم فاطمہ زیدی، میرے استاد میرے دوست، میرے ۰۰۰۰۰) ص ۴۰

۶۔ ایضاً، ص ۳۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۸، ۳۹

۸۔ ایضاً، ص ۶۳۔ (داؤد عثمانی، استادِ محترم ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی، ایک تاثر)

۹۔ ایضاً، ص ۱۵، ۱۶ (پروفیسر حسینی کاظمی، کلمات خیر، ابوالخیر کے لیے)

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۱۔ نثار احمد (مرتبہ) نوائے سروش (مجموعہ نعت و سلامت) سیرت اکیڈمی، جمعیت الفلاح، ۱۹۶۷ء، ربیع الاوّل، ۱۳۸۷ھ، کراچی۔ اس مختصر مجموعہ میں اُردو کی منتخب نعتوں کے ساتھ ساتھ تبرکاً عربی اور فارسی نعتوں کے بھی کچھ نمونے (جن کی تعداد آنحضورﷺ کی عمر شریف کی مناسبت سے کل تعداد ۶۳ رکھی گئی ہے) شامل کیے گئے ہیں تاکہ نعت کا دائرہ مکمل ہو جائے۔ نعتوں کے علاوہ ایک حصہ سلام کا بھی رکھا گیا ہے۔ اس میں ایک مقدمہ مختصر مگر جامع استادِ محترم جناب ثناء الحق صدیقی صاحب کا ہے اور ہر حصہ میں شعراء کی ترتیب زمانی کا خیال رکھا گیا ہے۔ نعت کا جو فنی اور تاریخی ارتقاء ہوا ہے اس کی چند جھلکیاں سامنے رہیں۔

۱۲۔ رحمانی، جناب سیّد صبیح الدین، نعت نگر کا باسی (ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی کی نعت گوئی و نعت شناسی کا ایک جائزہ) اقلیم نعت، کراچی، ۲۰۰۸ء

۱۳۔ ڈاکٹر نثار احمد، خطبہ حجۃ الوداع (حقوقِ انسانی کا عالمی منشور، تاریخی پس منظر، مکمل عربی متن، اُردو ترجمہ، توضیح و تشریح) انسٹی ٹیوٹ آف سیرت اسٹڈیز، بیت الحکمۃ، لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۴۔ بلقیس شاہین، (ترتیب) کشفی صاحب مزید آپ کے لیے (یونس حسنی، شعلہ و شبنم کا آمیزہ) زین پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۰۶ء، ص ۴۱، ۵۱

۱۵۔ ایضاً (سیّد ابوالحسنات حقی، میرے بھائی جان)، ص ۹۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۹۰

☆☆☆☆☆

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

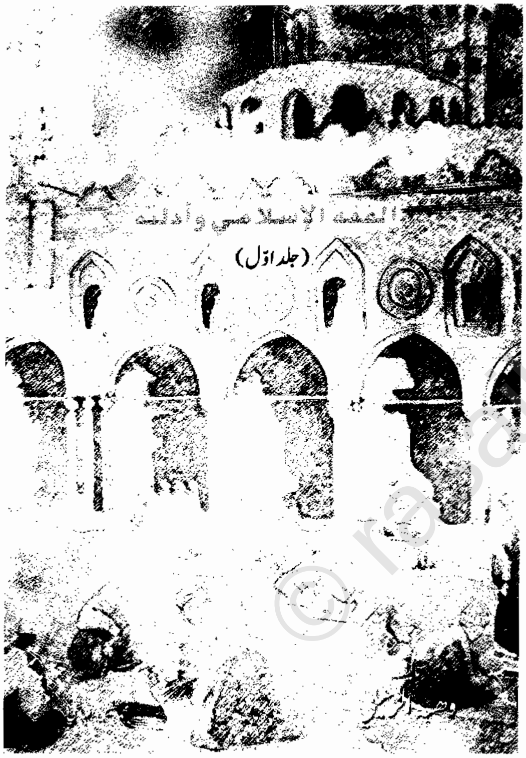

فقہ الاسلامی: دلائل ومسائل

عربی زبان میں تالیف کی گئی اسلامی فقہ کی ایک جامع کتاب 'الفقہ الاسلامی وادلتہ' ہے۔ گیارہ جلدوں پر مشتمل یہ کتاب مشہور محقق، فقیہ اور اسلامی قوانین کے عالم ڈاکٹر وہبہ الزحیلی کی کاوش ہے۔ عربی زبان میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کے علمی محاسن اور اس کی اہمیت کے سبب ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد نے اس کا اردو ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُردو میں اس کتاب کا اجراء ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے اشاعتی پروگرام میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

فقہ کے اس اہم مجموعے میں نقلی وعقلی دونوں مصادر و مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے جو چاروں بڑے مذاہب کی بنیاد ہیں۔ ائمہ اربعہ نے قرآن وسنت کے علاوہ اجتہادی آراء، قیاس، استحسان، مصالح مرسلہ، عرف وعادت، مصلحت اور سد ذرائع وغیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی فقہ کو مدون کیا تھا۔ ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی نے خود کو کسی ایک فقہی مسلک کے اجتہادات واستنباط تک محدود نہیں رکھا بلکہ اہل سنت کے چاروں مکاتب فکر کے دلائل پیش کر دیے ہیں۔ اس تقابلی اسلوب سے طلبہ اور محققین کے لیے مختلف آراء کا جائزہ لینا آسان ہو گیا ہے۔ کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں موجود تمام احادیث کی تخریج کی گئی ہے۔ ایک پوری جلد میں موضوعات اور فقہی مسائل کی جامع فہرست پیش کی گئی ہے۔ پہلی جلد، جو شائع ہو چکی ہے، طہارت اور احکام صلوٰۃ سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔

صفحات: ۱۰۴۰

قیمت: ۶۵۰ روپے

ISBN 978-969-408-278-3

© rasailojaraid.com